Woodbrooke Series.

What is the Meaning of History?

By PROF. L. LEVONIAN.

تاریخ کا مفہوم کیا ہے؟

مترجمہ

پادری ایس۔ این۔ طالب الدین صاحب بی۔ اے
پرنسپل تھیولاجیکل کالج سہارن پور

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی
انارکلی۔ لاہور
The P. R. B. S. Anarkali, Lahore.

طبع اول   سنہ ۱۹۴۶ء   تعداد ۵۰۰

تاریخ کا مفہوم کیا ہے

تاریخ کیا ہے:۔

تاریخ واقعات ماضیہ کے محض روزنامچہ کا نام نہیں۔ بلکہ خاص معیاروں اور اندازوں سے ان واقعات کی حیثیت جانچنے کو تاریخ کہتے ہیں۔ تاریخ کا تعلق فقط واقعات سے نہیں بلکہ تاریخ واقعات کی روشنی میں یہ دیکھتی ہے کہ انسان نے جاہلیت سے تہذیب کی موجودہ منزل تک کس طرح ترقی کی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ انسان نے ایک بلند اور بہترین زندگی کی تلاش میں جو روحانی جدوجہد کی ہے اس میں وہ ایک منزل مقصود کی طرف بڑھ رہا ہے پس تاریخ کا ایک مقصد ہے۔ تاریخ کا ایک مفہوم ہے۔

دِقت:۔

جب انسان دنیا کے طول و عرض پر نگاہ کرتا ہے۔ اس کی

تعداد نسلوں اور ان کے اختلافات۔ ہجرت اور کشمکش کا مطالعہ کرتا ہے اُن کی ہولناک بدی اور بربادی کو دیکھتا اور نیکی کی پامالی اور بدی کے فروغ کا ملاحظہ کرتا ہے تو خود اس باختہ ہو جاتا ہے۔ اور سوال کرتا ہے کہ تاریخ کیا ہے۔ اور وہ کونسے عناصر ہیں۔ جو واقعات پر اقتدار اور اختیار رکھتے ہیں اور انسانی زندگی کی تشکیل کرتے ہیں۔ کیا فطرت کی طاقتوں کا کھیل اور باہمی اثر واقعات پر قابض اور حاوی ہیں۔ یا ان کے علاوہ کوئی اخلاقی ضابطہ موجود ہے۔

کیا ہم یقین کر سکتے ہیں کہ کوئی تدبیر ہے جو ان پر مسلط ہے۔ یا قدرت ان پر حکمران ہے۔ یا ہماری زندگی کسی کور چشم تقدیر یا کسی چنچل من کے بس میں ہے۔ کیا تاریخ میں ارتقاء فی الواقعی ہے۔ یا زندگی محض بے معنی کا کھیل ہے۔ کیا ہمیں وثوق حاصل ہے کہ ترقی مستقبل میں جاری رہے گی۔ کیا زندگی کے رہنے کی تہ اور بنیاد بھی ہے یہ اور اس قسم کے سوالات ہمارے دماغ کو سرگرم عمل بنا دیتے ہیں اور نوع انسان کے متعلق ہمارے خیال کو متزلزل کر دیتے ہیں۔

مادی تاویل:۔

ان دقتوں کے متعلق ہمارا نکتہ نگاہ خواہ کچھ ہی ہو بلا یقینی ہے کہ انسانی زندگی کی نشوونما اور ارتقاء کو ایک کل کا ارتقاء سمجھنا اور اس کی مادی تاویل کرنا درست اور کافی

نہیں۔ انسان کی تاریخ کے سلسلہ کو نئے ہنتصبارون کی
ایجاد یا جیساکہ بعض نے کیا ہے انسان کی جسمانی ضروریات
سے ناپنا بے کار ہے۔ ان چیزوں نے سلسلۂ واقعات میں
ایک اہم کام کیا ہے مگر اُن کے علاوہ کچھ اور عناصر بھی ہیں جو
قابلِ التفات ہیں۔ مثلاً کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مسز بیچر سٹو
کی تصنیف بنام انکل ٹام زکیبن نے امریکہ والوں کی موجودہ
زندگی کی تشکیل میں جارج واشنگٹن کے قائم کردہ فوجی نظام
اور بھترنری اور ایڈیسن کی برقی ایجادات سے کم حصّہ لیا ہے۔
یا وسطی ایشیا کی تاریخ میں سکندر اعظم کی مہمات نے اُس کے
اُستاد حکیم ارسطو کے خیالات سے کم نمایاں کام کیا ہے
یا تاریخ یونان میں سقراط کا حصّہ پونیفیہ کی پہلی لڑائیوں سے
کسی طرح کم ہے۔ انسان ایک معیار ساز ہستی ہے اور مشاہیر
عالم اور اُن کے قائم کردہ معیاروں نے تاریخ کے بنانے
میں بہت کام کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایجادوں
اور مہموں کے محرک خاص خاص معیار تھے۔ اور تاریخ میں
ہم انسانوں کو ان معیاروں تک پہنچنے کے لئے ہاتھ پاؤں
مارتا ہوا دیکھتے ہیں۔ دراصل تاریخ کی ہم یوں بھی تعریف
کرسکتے ہیں ۔ کہ انسان کا اپنے معیاروں تک پہنچنے کی جدوجہد
کا نام ہی تاریخ ہے۔ جب کبھی کسی انسانی فرد کو کسی نئی
حقیقت کا مکاشفہ نصیب ہوا۔ یا زندگی کی نئی رؤیا عطا ہوئی
تو واقعات نے رُخ بدلنا شروع کیا۔ محض کلوں کی ایجاد سے

ہی تاریخ نہیں بنتی بلکہ مشاہیر اور اکابر کی شخصیتوں کا اثر بھی کام کرتا ہے۔ ہمیں واقعات کی ظاہری شان پر ہی نظر نہیں کرنا چاہیئے۔ بعض ذرا ذرا سے واقعات بھی بہت نتیجہ خیز ہوتے ہیں اور تاریخ کے سلسلۂ واقعات کی تاویل کے وقت ان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔

اخلاقی عنصر:۔

تاریخ کی تاویل کے مسئلہ میں اخلاقی عنصر بہت ہی اہمیت رکھتا ہے۔ کیا سلطنتوں کے بننے اور بگڑنے میں ہم اخلاقی قانون کو کام کرتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ یا کل کائنات کا کارخانہ غیر اخلاقی قوتوں کے قبضہ اور اختیار میں ہے۔ یہ ایک قدیم مقولہ ہے کہ راستبازی میں اقوام کی سرفرازی ہے اور بدی سے جماعتیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ کیا یہ مقولہ صحیح ہے اور کیا تاریخ میں اس کی دلیل پائی جاتی ہے۔ زمانہ ماضی میں اس پر بہت بحث رہی ہے۔ بعض لوگ تو اخلاقی قوتوں کا انکار قطعی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمام واقعات کی تہ میں ایسی قوتیں اور اصول کارفرما ہیں جن کو اخلاق سے کچھ سروکار نہیں۔ خواہ وہ واقعات سیاسی ہوں خواہ اقتصادی۔ اس عقیدہ کے لوگ درحقیقت اخلاقی قوانین کے وجود کے ہی منکر ہیں۔ ان کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی ہے کہ نیکی اور بدی کے معیار کا دارومدار موقع اور حالات پر ہوتا ہے۔ لہٰذا اقوام کی قسمت کا فیصلہ کسی اخلاقی قانون پر انحصار نہیں رکھتا۔ مگر ایک اور گروہ

ہے جو اخلاقی قانون کا قائل ہے لیکن اس گروہ کا کہنا یہ ہے
کہ اس اخلاقی قانون کا اطلاق ہر شخص کی ذاتی زندگی پر ہے
جماعتی اور قومی زندگی سے اس کا کچھ واسطہ نہیں۔ مگر ایک
تیسرا گروہ ہے۔ جو ان دونوں گروہوں سے کلی اختلاف رکھتا
ہے اور وہ اخلاقی قانون کو بے حد اہمیت دیتا اور مُقدم
سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ صرف اخلاقی قانون ہی انسانی
مُعاملات کا منبع ہے۔ خواہ وہ معاملات شخصی ہوں خواہ قومی ایسے
لوگ وہ ہیں جن کو انبیاء کی رُو یا حاصل ہوتی ہے۔

اخلاقی قانون :۔

اس مسئلہ کے متعلق ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ سب سے
اول اس سوال کے متعلق ہمیں اپنا نقطۂ نگاہ صاف کرنا
چاہیئے۔ اگر اخلاقی قانون سے مراد اخلاقیات کے تنگ نظر اور
سخت گیر قانون ہیں اور ہم انسانوں اور واقعات پر ان ہی
قانونوں کے معیار سے اچھے اور بُرے کا فیصلہ اور فتویٰ
دیتے ہیں۔ تو ہمارا فیصلہ اور فتویٰ غلط ہے۔ ہمیں انسانوں
اور واقعات پر مقامی حالات۔ عادات۔ رسم و رواج
اور کھانے پینے کے قاعدوں کے پیش نظر جو ممکن ہے کہ
ہماری نگاہ میں معیوب اور سقیم ہوں حکم نہیں لگانا چاہیے
بلکہ واجب اور ناواجب۔ صحیح اور غلط اور انصاف اور
بے انصافی کے اور بھی قانون ہیں جو حالات اور وقتی مصلحتوں
سے بلند و بالا اور پاکیزہ ہیں۔ ناظرین نے اپنے بے قصور

بھائی ہابل کو قتل کیا اور اس کا یہ فعل توریت کی نگاہ میں آج
بھی اسی طرح مذموم ہے جس طرح ہزار ہا سال پیشتر تھا دو ہزار اور
چار سو سال کا عرصہ گزرا ہے کہ اہل ایتھنز نے بلند پایۂ استاد
سقراط پر موت کا فتوے دے دیا تھا۔ اس حرکت میں آج
بھی ویسی ہی بے انصافی نظر آتی ہے۔ جیسی اس زمانہ میں دیکھی
گئی۔ ایسی حرکات پر مقامی رواجوں اور رائج الوقت دستوروں
کے معیار سے حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ ایسے فعل تو ہر جگہ
اور ہر زمانہ میں نامناسب ہوتے ہیں۔ اس میں کلام نہیں
کہ ہمارے فتووں پر زمانہ اور حالات کا بہت اثر ہوتا ہے
اور اگر ہم زمانہ کی ازلیت اور ابدیت کو نظر انداز کر دیں تو
ہماری زندگی بے معنی اور پھیکی رہ جائے گی ایک اخلاقی
قانون انسان کی سرشت اور خمیر میں مخفی ہے۔ جو نہ تو انسان
کی اختراع اور ایجاد ہے اور نہ ہی اُس کے گرد و پیش کے
حالات سے پیدا ہوتا ہے بلکہ ازلی اور لا ابدی ہے۔

تاریخ میں اخلاقی قانون:۔

اگر یہ افراد کی زندگی پر صادق آتا ہے تو کیا تاریخ کے سلسلہ
میں اس کی تصدیق نہیں ملتی۔ اگر ماضی کی صدیوں پر نگاہ
کریں تو ہم کو کیا نظر آتا ہے۔ کیا بادشاہوں اور عوام کو ان
کی خطاؤں کی واجب اور کما حقہ سزا ملتی نظر آتی ہے۔ اور
اُن کی قربانیوں کا واجب انعام ان کو حاصل ہوتا ہے۔
کیا ہم عدل و انصاف کی جگہ انتشار اور انحطاط پامال نہیں

دیکھتے۔ یقیناً اگر ہم تاریخ کو اس نگاہ سے دیکھیں کہ گویا تاریخ ایک وسیع قصرِ اخلاق ہے اور اس میں ایک عدالت عالیہ ہے۔ جس کا منصف ہر مجرم کو اُس کے جرم کے اندازہ سے سزا دیتا ہے اور ہر مستحق کو بے دریغ اور بلا طرفداری انعام و اکرام سے نوازتا ہے تو ہم کو مایوسی کا مُنہ دیکھنا پڑے گا۔ تاریخ میں عدل کی گرد گیر پابندی ہم کو نہیں ملے گی۔ تاہم تاریخ کے صفحات میں ہم کو جلی حروف میں لکھا ہوا نظر آتا ہے کہ انجام کار بدکیفر کردار کو پہنچتا ہے اور خدا کی چکی ہولے ہولے پیستی ہے۔ مگر خوب پیستی ہے۔

یونانی مورّخ ٹھُوسی ڈایڈز جو تاریخ کے متعلق قیاسات قائم کرتے وقت عدل اور اخلاق کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جزیرہ میلاس کے باشندوں سے اہل ایتھنز نے جو برتاؤ اور سلوک روا رکھا اُس پر یوں حاشیہ آرائی کرتا ہے کہ ۴۱۶ء قبل مسیح میں ایتھنز کی مطلق العنان حکومت نے جزیرہ میلاس میں ایک وفد کے ہاتھ اطاعت قبول کرنے کا پیغام بدیں الفاظ بھیجا کہ حق اور داد کا سوال تو مساوی طاقتوں میں پیدا ہوتا ہے۔ مگر ہم زبردست ہیں اور تم زیردست ہو۔ لہٰذا اطاعت اور ہلاکت میں سے جسے چاہو منظور کر لو۔ جزیرہ والوں نے اطاعت قبول نہ کی۔ اہل ایتھنز نے حملہ کر دیا۔ تمام مردوں کو تو تلوار کے گھاٹ اُتارا اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا تاہم یہ قصہ طے نہ ہوا۔ مورّخ کہتا ہے کہ اسی سال اہل

ایتھنز نے خودی اور تکبر کے نشہ سے مخمور ہو کر سسلی پر بھی ہلہ بول دیا۔ مگر ایتھنز کا ایک جوان بھی جان لے کر سسلی سے واپس نہ جا سکا۔ ایتھنز نے اپنے ظلم اور زیادتی کا واجبی بدلہ پا لیا۔ یہ ہے "تاریخ کا تلخ عدل"۔

فرونڈ جو گزشتہ صدی میں ایک انگریز مورخ ہوا ہے کہتا ہے کہ یقیناً جہالت۔ تعصبات اور بدی کا لازمی نتیجہ ہلاکت ہوتا ہے۔ جو تاریخ میں بدیہی امر اظہر من الشمس ہے۔ اس کا قول ہے کہ تاریخ نیکی اور بدی کے قانون کی صدا ہے۔ جو صدیوں میں گنبد کی آواز کی طرح گونجتی ہے قیاسات بدلتے رہتے ہیں۔ اطوار میں تغیر آتا ہے۔ عقیدے بنتے اور بگڑتے ہیں۔ مگر اخلاقی قانون ابدیت اور ازلیت کی لوحوں پر ثبت ہے۔ ہر باطل کلام اور نا راست فعل کے لئے۔ ظلم اور تشدد کے لئے اور حرص و ہوا کے لئے انجام کار قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ ضرور نہیں کہ کوئی گورو گھنٹال ہی خمیازہ بھگتے۔ تاہم کسی نہ کسی کو بھگتنا ضرور پڑتا ہے۔ صرف عدل اور حق کا بول بالا ہوتا ہے۔ بطالت اور انانیت کی عملداری دیر تک رہ سکتی ہے۔ مگر انجام کاران کا کوچ نقارہ ضرور بجتا ہے۔

عبرانی انبیاء:۔

اس تعلق میں عبرانی انبیاء کی الہامی تحریریں تاریخ کے عمل کو سمجھنے کے لئے بہت ہی مفید مطلب ہیں سیاسی

ابتریوں اور تباہ خیزیوں اور ان کے اخلاقی اور مذہبی اسباب کی تشخیص اور تحقیقات میں ان کی سعی کامیاب رہی ہے اسرائیلی شاہوں اور شہنشاہوں نے ہمیشہ قوم کی دولت اور ثروت کی فکر کی اور انبیاء نے ہمیشہ عوام کے تنزل اور سماجی بدحالی کو طشت ازبام کیا۔ اُن کے سیاسی لیڈر اُمراء کے محلات کی زینت اور عشرت سے اسرائیلی سلطنت کی سطوت اور پائیداری ناپتے تھے۔ مگر انبیاء ہمیشہ غرباء کی جھونپڑیوں کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ جن سے مسکینی اور افلاس عیاں تھا۔ اور اس بے انصافی پر اور ظلم پر انگلی رکھتے تھے جو صاحب مال ومنال غربا پر روا رکھتے تھے۔ اُن کے کاہن اُن کی تباہ حالی کو ہمسایہ اقوام کی وحشت اور جہالت سے منسوب کرتے۔ اور اُن اقوام کو بددعا دیتے تھے اُن کے پیغمبر کہتے تھے کہ اپنی گمراہی اور ذلّت پر نگاہ کرو۔ گناہ نے زہریلے پھوڑے کی طرح قوم کی قوت کو چوس لیا تھا۔ چنانچہ جب بحران طاری ہوا تو وہ قوم سنبھل نہ سکی۔ اسرائیل کی تاریخ میں انبیاء کی تشخیص اور فتوے بجا تھا۔

انبیاء اور پیش خبری:۔

تاریخ اسرائیل میں انبیاء کی بصارت اور دُوربینی صرف اخلاقی اور سماجی حالات کی بنا پر نہ تھی۔ اس کی تہ میں مذہب بھی تھا۔ اکثر اوقات یہ سوال کیا گیا ہے کہ انبیاء کس طرح پیشن لگانے اور مستقبل میں وقوع ہونے والے واقعات کی

خبر دیتے تھے ۔ مثلاً سامریہ کی بربادی یا یہودیہ کے دارالخلافہ یروشلم کی تباہی ۔ انبیاء کی پیش خبریاں شعبدہ بازی نہ تھیں۔ بلکہ اُس روحانی بصارت سے پیدا ہوتی تھیں جو یہوواہ کی قربت سے اُن کو حاصل ہوتی تھی ۔ نبی جادوگر نہ ہوتا تھا ۔ بلکہ ایک حق پرست انسان ہوتا تھا ۔ جو خدا سے استخارہ اور استشارہ کرتا تھا ۔ وہ صورت حالات کو بھانپ کر اور دلیل بازی اور فراست سے نتائج اخذ کر کے لوگوں کو نہیں سناتا تھا ۔ بلکہ اُس کو خدا کی مشورت اور ہدایت نصیب ہوتی تھی اسی لئے جو کچھ کہتا تھا وثوق سے کہتا تھا ۔

انبیاء ولی اللہ تھے ۔ اور چونکہ ان کو خدا کے ساتھ بے تکلفی اور قربت حاصل تھی وہ نیکی اور بدی میں خوب امتیاز کرتے تھے اور انسان میں اس کے طرز زندگی سے خدا کا ارادہ پڑھ لیتے تھے ۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ اکثر سیدھے سادے انسان اپنے دل کی صفائی کے باعث واقعات پر عالموں اور عاقلوں کی بہ نسبت بہتر اور صائب رائے دیتے ہیں ۔ انبیاء بھی اسی قسم کے انسان تھے ۔ وہ مزاج کے کڑے تھے ۔ ان کی پرورش وادیوں کی صاف ہوا میں ہوئی تھی ۔ وہ شہروں اور محلوں کی آلودگی سے مامون اور محفوظ ہوتے تھے ۔ مگر خدا کے حقیقی عرفان سے بہرہ ور ہوتے تھے وہ ایمان رکھتے تھے کہ یہ نہیں کہ خدا صرف انسان کا خالق ہے ۔ اور بس بلکہ وہ تاریخ کا بھی مالک ہے ۔ اس کو تاریخ میں

دخل حاصل ہے۔ کیونکہ اقوام کی عاقبت سازی خدا کی راستبازی اور قدوسیت پر ہی مدار رکھتی ہے

انبیاء اور خوارق قدرت:۔

قدرت میں جو خوارق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ان کو انبیاء کی طرح خدا کا فضل سمجھ کر ان کی تاویل کرنا چاہیئے انبیاء ایسے کم عقل نہ تھے۔ کہ خوارق کو جادوگری پر اور کسی ساحرانہ قوت پر محمول کرتے۔ وہ ایمان رکھتے تھے کہ خدا قدرت کے غیر معمولی مظاہروں کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ چنانچہ جب اسرائیلی مصر کی غلامی سے رہا ہو کر بھاگے اور لال سمندر کے ساحل پر پہنچے اور اور ایک مشرقی ہوا نے اُن کے سامنے کے پانی کو دھکیل کر تودہ کی طرح ایک طرف کھڑا کر دیا۔ اور وہ سوکھے پاؤں اس میں سے پار نکل گئے تو اسرائیلی نبیوں نے اس کو اتفاقیہ امر نہ سمجھا بلکہ کہا کہ قوم کی مدد اور بچاؤ کے لئے خدا نے براہ راست یہ کام کیا ہے۔ انبیاء کے مذہبی عقیدہ میں خدا اور اُس کے جوہر کے متعلق نظریئے اور قیاسات نہیں بیان کئے گئے بلکہ جو بڑے بڑے کام اُس نے تاریخ میں کئے ہیں۔ اُن کا بیان کیا گیا ہے۔ ان کا عقیدہ سماوانی یا مابعد الطبیعاتی نہیں بلکہ تاریخی ہے۔

یسوع مسیح اور تاریخ میں اُس کا منصب:۔

یسوع مسیح انبیاء کی صفت میں تھا۔ اسی لئے اُس نے تاریخ کی جو تاویل کی اس میں نبوت تھی۔ وہ انبیاء کی طرح

ایمان رکھتا تھا کہ تاریخ محض سلسلہ واقعات اتفاقیہ نہیں بلکہ اس میں ایک مقصد نہاں ہے اور خدا کا ہاتھ تمام وقوعات کو قرینہ اور ترتیب دے کر ان کا رخ اپنے الٰہی مقصد کی طرف کرتا ہے۔ اس کو وثوق حاصل تھا کہ تاریخ اقوام میں تنبیہ اور غضب کے دن کبھی ہوتے ہیں اور ان کے ردّ و قبول میں اقوام کی قسمت کا راز ہوتا ہے۔ مثلاً مسیح قائل تھا کہ اس کے زمانہ میں یروشلم شہر اور اس کے زمانہ میں یروشلم شہر اور اسکے باشندوں کی زندگی میں وہ دن پہنچ چکے تھے۔ مگر انہوں نے تنبیہ اور سرزنش کو ٹھکرا دیا تھا۔ اور یوں اپنی ہلاکت پر مہر کر دی تھی۔ اس نے پہاڑ کی چوٹی سے شہر کو دیکھا۔ اس کا دل بھر آیا۔ اور وہ رویا اور کہا کہ اے یروشلم اے یروشلم تو جو نبیوں کو قتل کرتی ہے اور جو تیرے پاس بھیجے گئے ان کو سنگسار کرتی ہے کتنی بار میں نے چاہا جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے چھپاتی ہے۔ میں بھی تیرے بچوں کو جمع کر لوں مگر تم نے نہ چاہا۔ دیکھو تیرا گھر بربادی کے لئے چھوڑا جاتا ہے۔ ایک اور موقع پر جب اس کے شاگردوں نے فخر و مباہات سے ہیکل کی عالیشان عمارتیں دکھائیں تو اس نے ان کو کہا کہ میں تم کو سچ کہتا ہوں کہ پتھر پر پتھر باقی نہ چھوڑا جائے گا جو گرایا نہ جائے گا۔ یہ فتویٰ سناتے وقت مسیح کو بے حد رنج ہوا ہوگا۔ مگر یہ ان کے گناہ اور بدکرداری کا لازمی نتیجہ تھا۔ شہر نے آگاہی اور

تنبیہ کو حقیر جانا۔ اور اپنی شامتِ اعمال کے دن کو بھول گیا۔ جو کچھ اُنہوں نے پیش خبری کہا گیا تھا۔ جب وہ پورا ہوا تو مسیح کے فتوے کی تصدیق اور توثیق ہو گئی۔ اور جب تھوڑے ہی عرصہ کے بعد شہر تہس نہس ہوا تو لوگوں کو مسیح کے الفاظ یاد آئے۔

مسیح اور دکھ کا مسئلہ :-

مسیح یقین رکھتا تھا کہ جو ہر شخص میں خصوصاً اور عام طور پر بھی زندگی کی بنیاد اخلاق پر ہے۔ تاہم وہ جمہور کے ساتھ اس نظریہ کا قائل نہ تھا کہ صرف راستباز ہی خوش حال ہوتا ہے۔ اس کو خوب معلوم تھا کہ تاریخ میں اور خود اس کے اپنے زمانہ میں کتنے نبی ستائے گئے۔ اور سنگسار کئے گئے اور یہ نظریہ اُن کے حق میں صادق نہ ٹھہرا۔ مسیح کے عقیدہ میں ایک اُبھری ہوئی حقیقت یہ تھی کہ دکھ بجائے خود بدبختی اور لعنت نہیں ہوتا۔ اس کا اعتقاد تھا کہ راستبازی اور صداقت کے لئے دُکھ اٹھانا ہی بدی پر غالب آنے اور نیکی کے فروغ کا گُر ہے۔ اُس نے کہا کہ جب لوگ تمہیں لعن طعن کریں اور ستائیں اور ہر طرح کی بُری باتیں جھوٹ سے تمہارے حق میں کہیں تو تم کو مبارک ہو۔ کیونکہ انہوں نے نبیوں کو جو تم سے پہلے تھے اسی طرح ستایا تھا۔ صادق اور راستباز کا قانونِ معوّضیہ کے طریق پر عوضی بلکہ بدوں کے ہاتھوں دکھ اٹھانا ایک ایسا عقیدہ

اٹھا ہے جس نے دکھ کے مسئلہ کے معنی یکسر بدل دیئے ہیں۔
اس نظریہ نے کہ نیک کے دکھ اٹھانے سے بدی مغلوب
اور گنہگار مغلوب ہوتا ہے دکھ کے تصور میں عظیم انقلاب
برپا کر دیا ہے۔ انسانی زندگی میں دکھ کو ایک المناک اور
حسرت انجام چیز ثابت کرنے کی بجائے اس کو فتح کا درجہ دیا
ہے بے قصور سقراط نے شریر لوگوں کے ہاتھ سے دکھ
اٹھایا۔ مگر اس کے استقلال اور ہمت نے بے شمار نوجوانوں کو
یہ سبق سکھا دیا کہ حق اور عدل کے لئے جان دینا ثواب ہے استیفان
جو زمانہ سلف کا ایک مسیحی تھا۔ سنگسار کیا گیا۔ مگر اس
سے بے ترس مجذوب ساؤل کی کایا پلٹی اور وہ محبت کا رسول
بن گیا۔ کیمبرج کا مورخ لارڈ ایکٹن غلامی کے انسداد اور
آزادی کے نفاذ کا بیان کرتا ہوا ثابت کرتا ہے کہ قوت اور
تشدد کی حکمرانی اور متواتر بے انصافی کی روک تھام کے لئے
مجبور ہو کر زیردستوں اور کمزوروں کی مشترکہ کوششوں سے
چار سو سال کے عرصہ میں جلد ہی جلدی بدلتے ہوئے مگر دھیرے
دھیرے ترقی کرتے ہوئے حالات کے درمیان آزادی کمائی
گئی محفوظ رکھی گئی اور پھیلائی گئی ہے۔ اور انجام کار اس
کا صحیح مفہوم انسانوں کے ذہن میں آتا ہے۔ گزشتہ
صدیوں میں صداقت اور آزادی کی قیمت بہت سے
صالح انسانوں کو ادا کرنی پڑی اور آج ہمارے میں زمانہ بھی
ایسا ہو رہا ہے۔

مسیح کی ذات :-

تاریخ میں مسیح کا منصب صرف اُس کی تعلیم سے نہیں بلکہ اس کی ذات سے ظاہر ہوتا ہے جس میں اس کی تعلیم مجسم تھی۔ مسیح نئے خیالات کا اشتہار دینے والا فیلسوف نہ تھا۔ بلکہ وہ سرتاپا ایک ٹھوس تخیل تھا۔ وہ خوشخبری کا قاصد ہی نہ تھا۔ بلکہ خود خوشخبری تھا۔ وہ انجیل مجسم تھا۔ وہ خدا کا کلام سنانے والا نبی ہی نہ تھا۔ بلکہ خود کلام خدا تھا۔ مسیح دنیا میں کوئی نیا خیال اور تصور لے کر نہ آیا۔ بلکہ خدا کو لے کر آیا۔ اُس کا کلام خدا کا کلام تھا اور اس کا کام خدا کا کام تھا وہ انسانیت میں الوہیت کا ظہور تھا۔

اس کے کیا معنی ہیں۔ یہ ایک فلسفیانہ سا تکرار معلوم ہوتا ہے۔ مگر نہیں ایسا نہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ مسیح کی آمد سے تاریخ میں ایک بے مثال واقعہ گزرا ہے۔ انسانی زندگی میں ایک نئی قوت داخل ہو گئی ہے۔ مسیح یسوع نبی آدم اور کل کائنات کے لئے الٰہی مرضی کا مکاشفہ ہے۔ نیز مسیح کل تاریخ کی انتہا اور منزل مقصود ہے۔ اس کے بغیر تاریخ بے معنی اور بے کار ہے۔

اس کا تعلق ہماری روزمرہ کی زندگی کے مسائل سے ہے۔ اگر آپ اپنی زندگی کا رُخ اور اُس کے حشر کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ تو اُس کا موازنہ مسیح یسوع سے کیجئے اگر آپ

تاریخ کے واقعات پر صحیح فیصلہ اور فتوٰی دینا چاہتے ہیں تو مسیح کی طبیعت اور رُوح کے بغیر آپ ہرگز ایسا نہیں کر سکتے۔ اگر آپ اپنی شخصی اور قومی زندگی کی عمارت کو استوار بنیاد پر تعمیر کرنے کے خواہشمند ہیں۔ تو مسیح سے مشورہ لے کر اُس کے مطابق عمل کیجئے۔ وہ زندگی کا حقیقی معیار اور آخری ناپ ہے۔ جب وہ ساتھ ہے۔ تو نجات ہے مگر جب وہ ساتھ نہیں تو ابتری اور تباہی ہے۔

یسوع اور خدا:۔

اس سے ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ازلی و ابدی خدا انسان کی تاریخ میں کس طرح داخل ہوتا ہے۔ اور پھر بھی تاریخ کی حدود سے بعید و بالا رہتا ہے اس سوال کا پیدا ہونا طبعی امر ہے مگر اس پر دو پہلوؤں سے نگاہ ڈالی جاسکتی ہے۔ اول یہ مسئلہ نظری اور سماوانی یا مابعد الطبیعاتی ہے اور دوم یہ مسئلہ عملی ہے اور واقعات سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر اس کو سماوانی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو کئی دقتیں رونما ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسیح کو صحیح طور پر سمجھنے میں انسانوں نے لغزشیں کیں اور ٹھوکریں کھائی ہیں۔ مسیح ایک استاد تھا جو دعوت عمل دیتا تھا وہ حقائق سے دوچار ہونے کی دعوت دیتا تھا۔ اور جس نے بھی واقعیت بینی کی کوشش کی ہے مسیح یسوع کی بابت کو سمجھ لیا ہے۔ یہودیوں کو یہ خبط سوار رہتا کہ خدا فقط

انہیں کا خدا ہے۔ مگر مسیح نے اُن کو ہدایت کی کہ آنکھیں آسمان کی طرف اٹھاؤ اور دیکھو کہ اس کا سورج نیکوں پر اور بدوں پر اور ہر قوم پر یکساں چمکتا ہے اور وہ راستوں اور ناراستوں دونوں پر بارش برساتا ہے۔ کیا مسائل کو سمجھنے کے لئے یہ ایک صحیح اصول نہیں کہ محض خشک قسم کی ذہن بازی سے کام نہ لیا جائے بلکہ نفس الامر کو دیکھ کر رائے قائم کی جائے۔ مذہب میں خدا سے متعلقہ مسائل کو سمجھنے کے لئے یہ اصول بہت لازمی ہے۔ بھلا محدود العقل انسان اپنے استدلال سے اور نظری جستجو سے خدا کا بھید کہاں پا سکتا ہے۔ ہمیں واقعات میں ... کے عمل کو دیکھنا چاہئے۔

تاریخ میں متعدد واردات ایسی ہوتی ہیں جو اتفاقی اور رفتنی و گزشتنی ہوتی ہیں۔ وہ وقتی ہوتی ہیں۔ اور محدود عرصہ میں رفت گزشت ہو جاتی ہیں۔ مگر ایسی واردات بھی ہوتی ہیں جو دوامی اثر رکھتی ہیں۔ ان کے وقوع کی ایک خاص گھڑی ہوتی ہے۔ مگر ان کا اثر کل زمانہ کے لئے ہوتا ہے وہ ایک بار وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ بار بار نہیں ہوتیں مگر ان کا نقش دائمی ہوتا ہے۔ دنیا میں مسیح یسوع کی آمد بھی اسی قسم کا ایک واقعہ ہے۔ وہ تاریخ عالم کا قطب ستارہ ہے۔ سب کو تغیر اور انقلاب ہے۔ مگر وہ آج اور کل اور ہمیشہ یکساں ہے

جنہوں نے یسوع کو صلیب پہ لٹکایا یا اس مصلوب مسیح کی مانند ہوگا جس نے دشمنوں کے لئے دعا کی۔ یہ فیصلہ ہر انسان کو خود کرنا ہے۔ اور اپنی عاقبت بنانا ہے۔

انسان کیا ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے فلسفہ کی کتابوں کی ورق گردانی نہ کیجئے بلکہ مسیح پر آنکھیں جمائیے۔ مسیح میں خدا اور انسان کی مصاحبت ہے۔ اس میں ہم کو صاف نظر آتا ہے کہ خدا کیسا ہے اور انسان کیا کچھ بن سکتا ہے۔ خدا کے ذہن میں انسان کا جو تصور ہے۔ وہ مسیح میں مجسم نظر آتا ہے وہ خدا کی معرفت اور انسانی زندگی کے صحیح تصور کا دروازہ ہے اس کی زندگی ان سب کے لئے جو صحیح انسانی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں ایک معیار ہے۔ اس نے کیا خوب کہا ہے۔ کہ اے تم لوگو جو تھکے اور بڑے بوجھ سے دبے ہو سب میرے پاس آؤ۔ میں تم کو آرام دوں گا۔ ہم کس کے پاس جائیں۔ کون ہمارا نمونہ اور معیار ہے۔ کیا لکشمی جو دولت اور ثروت کی دیوی ہے یا یسوع مسیح جو قلمروئے محبت کا سلطان ہے؟ ہم نے اندھا دھند اپنی تدبیروں اور ذاتی اغراض کی پیروی کی ہے کون نوع انسان کو حرص و ہوا سے اور حُبّ جاہ سے مخلصی دلا سکتا ہے۔

بعض انسان کچھ اس طرز کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جس کو ہرگز زندگی نہیں کہہ سکتے۔ اُن کے لئے زراندوزی شکم پروری نفس کوشی اور زرق پرستی کا نام زندگی ہے ایسی

زندگی ایک فریب ہے ۔ چھلاوہ ہے ۔ موج سراب ہے ۔
اور اس کا انجام حسرت اور ملال ہے ۔ کون ہم کو زندگی کے اس
مادی اور فریب دہ طرز سے بچا سکتا اور ایمان ۔ محبت راستی
اور نیکی کی زندگی کی ترغیب اور تشویق دلا سکتا ہے ۔ انسان
اپنی انسانیت کے شرف اور تفضل کو فراموش کر چکا ہے ۔
اور جذبات حیوانیہ کا غلام اور اطاعت گزار بن کر راستبازی
اور عدل کی اقدار کو پامال کر رہا ہے ۔ کون ہم کو ہماری انسانیت
کا شعور عطا کر سکتا ہے زندگی کے معنی سمجھا سکتا اور ہماری
عاقبت سُدھار سکتا ہے ۔ کون ہمارے نقطۂ نگاہ
کو بدل کر ایسا بنا سکتا ہے کہ ہم اپنے حقوق پر نہیں بلکہ
اپنی ذمہ داریوں پر دھیان کریں دنیا میں امن اور نشاط
کے قیام کا فقط ایک ہی طریقہ ہے ۔ کہ انسان ذاتی حقوق
کو امن پر قربان کر دے ۔ کون یہ حقیقت ہمارے ذہن نشین
کر سکتا ہے کہ باوجود رنگت اور قومیت کے اختلافات کے
روحانی اعتبار سے ہم ایک ہی ہیں ۔ ذات ایک ہی ہے یعنی
انسانی ذات ۔ اور خدا ایک ہی ہے ۔ جو سب انسانوں
کا باپ ہے ۔ کون ہمیں یہ حقیقی علم دے گا ۔ کون ہمیں وہ
محبت دکھائے گا ۔ جو ہمارے دلوں کو مسخر کر سکتی اور ہم
انسانوں میں وحدت قائم کر سکتی ہے ۔
زندگی کے آخری ایام میں جب مسیح نے علی الاعلان روحانی
حقیقتوں کا اعلان کیا ۔ جان نثاری کی تشریح کی اور دوسروں

اور بے نور کیا ہے - تو وہ کل دنیا میں بھی گناہ کو مغلوب اور بے زور کر سکتا ہے پس خدا کی قدرت پر ایمان رکھنا ایک ذاتی مذہبی تجربہ پر مدار رکھتا ہے - جو کچھ ہمارے تجربہ میں آ چکا ہے - اسے ہم کل دنیا کے لئے ممکن جانتے ہیں

ایک دفعہ مسیح نے دو اندھوں کو جو اس سے رحم کی درخواست کر رہے تھے کہا کہ کیا تم ایمان رکھتے ہو کہ میں تمہاری آنکھیں کھول سکتا ہوں - انہوں نے جواب دیا کہ ہاں خداوند ہم ایمان رکھتے ہیں - تب مسیح نے فرمایا کہ جیسا تمہارا ایمان ہے - ویسا ہی تمہارے لئے ہو - تاریخ اور اس کی حقیقت کے بارہ میں بالکل یہی بات ہے - اس کی حقیقت کو سمجھنا ہمارے ذاتی ایمان پر مدار رکھتا ہے - ذاتی ایمان ہی تمام مذہبی اعتقادات کی یقینی ضمانت ہے -

پی - آر - بی - ایس پریس - لاہور میں باہتمام
مسٹر ایف - ڈی - وارث سکرٹری پنجاب
ریلیجس بک سوسائٹی انار کلی لاہور - پرنٹر و
پبلشر چھپ کر شائع ہوا